ذکرِ رفیق!

جیل اور ریل میں انسان کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آجاتا ہے یعنی وہ عادتیں جو ہم ایک دُوسرے سے عام طور پر چھپانے میں کامیاب رہتے ہیں جیل اور ریل کی مصاحبت میں دَاشگاف ہو جاتی ھیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ جبریہ مصاحبت باقی عمر کے لئے ساتھی بخش دیتی ہے، چودھری صاحب مرحوم سے رفاقت کی نعمت مجھے جیل میں نصیب ہوئی اور جب تک زندہ رہے ان کی صُحبت اور رفاقت سے میں خوشہ چینی کرتا رہا ___

انسانی زندگی میں جیل اور مُسافرت دو ایسے مقامات ہیں جہاں ایک دوسرے سے قُرب اور مصاحبت اختیاری نہیں ہوتی یعنی رفقائے سخن یا سفر کا انتخاب اپنی مرضی سے نہیں ہوا کرتا۔ عام میل ملاپ میں ایک دوسرے کے ساتھ رکھ رکھاؤ یا تکلف برتنے میں آسانی کے ساتھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ یعنی ہم ایک قلیل وقفہ میں اپنی صحیح عاداتِ اخلاق کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھنے میں کافی مشاق نظر آتے ھیں لیکن وہی لوگ ایک طویل مدت کی ہم سفری اور جبریہ قیام کے زمانہ میں اس قدر ایک دوسرے سے دُور اور متنفر ہو جاتے ہیں جس کا بادی النظر میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ روزانہ صبح کی سیر میں دو تین سال تک گھومنے والے انسان گویا ہی بے تکلف دوست یا ساتھی سمجھے جائیں۔ لیکن اگر ان کو بھی دو تین ماہ ایک دوسرے کی مصاحبت اختیار کرنی ناگزیر ہو جائے تو لازمی نہیں کہ وہ ایک دوسرے سے مخلصانہ طور پر رابطہ قائم کر سکیں۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے کی لازمی رفاقت میں اپنے اصلی خدوخال کو ایک دُوسرے سے چھپانے یا تکلف برتتے ہوئے اپنے آپ کو اس حیثیت میں پیش کرنا جو حقیقت اور جبلّت سے دُور ہو، انسانی بس کا روگ نہیں۔ برادرم حضرت شاہ جی (مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) اکثر فرمایا کرتے ھیں کہ:

"جیل اور ریل میں انسان کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آجاتا ہے۔"

یعنی وہ عادتیں جو ہم ایک دوسرے سے عام طور پر چھپانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ جیل اور ریل کی مصاحبت

میں نہ چھپائے رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی نگاہوں سے گر جاتے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ حُسن اتفاق سے یہ جبریہ مصاحبت باقی عمر کے لئے ساتھی بھی بخشش دیا کرتی ہے۔ چودھری صاحب مرحوم بھی میرے لئے وہ نعمتِ عظمیٰ تھے جو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے جیل کی رفاقت میں مجھے میسّر ہوئی اور جب تک زندہ رہے ہیں، میں برابر اُنکی صحبت اور رفاقت سے خوشہ چینی کرتا رہا۔

چودھری صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات اوائل ۱۹۲۱ء میں ڈسٹرکٹ جیل انبالہ کے سپیشل وارڈ میں اس زمانہ میں ہوئی جب متحدہ ہندوستان پہلی دفعہ آزادیٔ ملک اور مسئلۂ خلافت کی بنا پر عوامی تحریک کی صورت میں برطانوی سامراج کے خلاف تحریک عدم تعاون کے نام پر نبرد آزما ہوا تھا اور تاریخ سے بے پرواہ ہوکر دیوانہ وار ہزاروں افراد نے سطحی آرام کی زندگی پر جیلوں کی تاریک اور ذلیل زندگی کو ترجیح دی۔ چودھری صاحب مرحوم صفِ اوّل کے اُن جوانمردوں میں سے تھے جنہوں نے بے مثال ایثار و قربانی سے نہ صرف ایک خوشحال زمیندار خاندان کے مفاد کو خطرے میں ڈال دیا بلکہ لودھیانہ شہر کے سٹی کوتوال کی حیثیت سے اپنی ملازمت کو بھی تیاگ دیا۔ ہنسی خوشی اُس خار زار وادی میں قدم رکھنا پسند کیا، جہاں تنگ دستی اور ملامت ہر ہر قدم پر دامن گیر ہوا کرتی ہے۔

استقامت اور صبرِ عظیم کا یہ پیکرِ نُور کے تڑکے ہمارے درمیان پہنچایا گیا اور چند ہی دنوں میں اپنے بے پناہ اخلاص، زبردست قوتِ ارادی اور پاکباز کرکٹر کی وجہ سے ہم لوگوں میں اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں تک کہ یہی رفاقت ترقی کرتے ہوئے میرے لئے ایک بزرگ بھائی کی شفقت آمیز محبت، اعتماد اور رہنمائی میں تبدیل ہوگئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بسا اوقات میرے دل و دماغ میں یہ خوشکن احساس غالب ہوتا رہا کہ اپنے ذاتی مفاد کے متعلق میں خود اس طرح سوچ نہیں سکتا تھا۔ جس دل بستگی کے ساتھ چودھری صاحب مرحوم میرے معاملات پر توجّہ دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اسی قسم کی خوبی انسانوں میں صرف اسی وقت ودیعت ہو سکتی ہے جب اُنکی سرشت میں دوسرے کے لئے مخلصانہ شیفتگی کا جذبہ کارفرما ہو۔ مجھے فخر ہے کہ اسی سلسلہ میں چودھری صاحب موصوف ہم سب میں چوٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض معاملات میں باہمی اختلافات کے باوجود چودھری صاحب موصوف کے اخلاص اور بلندیٔ فکر میں کبھی بھی ساتھیوں میں ادنےٰ سا شُبہ بھی پیدا نہ ہو سکا۔

انبالہ ڈسٹرکٹ جیل کو اس زمانہ میں میانوالی ڈسٹرکٹ جیل کی طرح دہلی اور پنجاب کے سیاسی قیدیوں کے لئے سیاسی جیل کی حیثیت میں مختص کیا گیا تھا چنانچہ یہاں بھی امرتسر، جالندھر، لودھیانہ، انبالہ، ہوشیارپور، رہتک

حصار، اور دہلی کے رضا کار اور کارکن ساڑھے تین صد کی تعداد میں محبوس تھے جن میں مشکل سے پچاس کے قریب سپیشل کلاس اور ان میں چودھری صاحب مرحوم بھی ایک سال با مشقت لے کر شامل کئے گئے۔ واضح رہے کہ اس عوامی سیاسی تحریک سے پہلے عام طور پر سوسائٹی کو جیل کے اندر کی غیر انسانی زندگی سے کوئی شناسائی نہ تھی اور نہ ہی حکام جیل قیدیوں کے انکار و تکرار کے خوگر تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آزادیٔ ملک کے شیدائیوں کی ٹکر جیل کے حکام سے از بس ناگزیر تھی جو ہو کر رہی اور ملک کو یکایک سیاسی تحریک کے بیرونی اثرات کے ساتھ ساتھ جیلوں کے اندرونی خلفشار اور بدامنی کی کارروائیوں سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ یہی صورتِ حال انبالہ جیل کے کارپردازوں کے لئے بھی خاصی دردِ سر بنی۔ چنانچہ روایتی نظم و ضبط اور افسرانہ وقار کی بحالی کے لئے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات نے اپنے محکمہ کے ایک خاص افسر چودھری محمد اکبر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بنا کر انبالہ میں تعینات کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سی کلاس قیدیوں کو ہفتہ میں دو دفعہ گندم کی روٹی اور باقی ایام میں مکئی کی روٹی کھانے کو ملتی تھی جو نہ صرف کچی ہوتی تھی بلکہ مٹی وغیرہ کی آمیزش کی وجہ سے کھانے کے ناقابل تھی۔ اور احتجاج کے باوجود افسرانِ جیل اس میں مناسب تبدیلی کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف مشقت کے لئے بان نہ صرف مقدار کے مطابق تیار نہ کیا جا سکتا تھا بلکہ اس کی تیاری میں قیدیوں کے ہاتھ بھی زخمی ہو جاتے تھے۔ اس لئے مشقت تبدیل کرنے کا مطالبہ از بس ناگزیر تھا جس پر مناسب توجہ نہ ہونے کے باعث سیاسی قیدیوں نے خوراک لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکامِ جیل کی روش نامناسب حد تک سخت ہوتی گئی یہاں تک کہ مصالحت سے مایوس ہو کر ہم لوگوں نے بھی سپیشل کلاس کی مراعات ترک کر دیں۔ اسی اثناء میں ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس انبالہ سہ ماہی دورہ پر تشریف لائے اور جب ہمارے احاطہ میں پہنچے تو کپتان پولیس مسٹر پرائیس نے چودھری صاحب مرحوم کو پہچان لیا۔ جو استعفٰی داخل کرنے سے پہلے ان کے ماتحت سب انسپکٹر پولیس کی حیثیت میں رہ چکے تھے۔

یہاں پر وہ مکالمہ نقل کرنا عبث نہ ہوگا جو برطانوی نوکر شاہی کے اس معزز نمائندے اور آزاد ہندوستان کے خواب دیکھنے والے غیور اور بے باک نمائندے کے درمیان رونما ہوا جو آگے چل کر اس رُخ فرسا ڈرامے پر منتج ہوا جو اپنے پیچھے ایک ایسی یادگار چھوڑ گیا جس کا برطانوی سامراج کوئی جواب نہیں دے سکتا لیکن آزادی پسند دنیا آنیوالے ہر دور میں اس پر فخر و مباہات کے ڈونگرے برساتی رہے گی۔

مسٹر پرائیس :۔ ہیلو ! آپ چودھری افضل حق ہیں ؟

چودھری صاحب :۔ جی ہاں ! میں وہی ہوں۔

مسٹر پرائیس :۔ (طنز آمیز شرارت سے) اب تو آپ اِس جگہ بہت خوش ہوں گے؟

چودھری صاحب : (ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) آیئے! مجھ سے جگہ تبدیل کر لیجئے۔ پھر آپ خود ہی جواب محسوس کر لیں گے۔"

ظاہر ہے کہ اِس بیباکانہ جواب کا تو کوئی جواب نہ تھا۔ البتہ جملہ افسران بڑبڑاتے ہوئے ایک دم واپس ہوئے اور سیدھے جیل کی ڈیوڑھی میں پہنچے جہاں ڈپٹی کمشنر صاحب نے جو یہودی بھی تھے اور ایک آنکھ سے بے نیاز بھی۔ جیل کے رجسٹر میں درج کیا کہ جیل کے معائنہ میں چودھری افضل حق سیاسی قیدی کا رویہ چونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے گستاخانہ رہا ہے اِس لئے ان کو عبرتناک سزا دینی چاہیئے تاکہ افسران کا وقار سلامت رہے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ آپ نے جھٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کو مشورہ دیا۔ کہ چودھری صاحب موصوف کو باقی قیدیوں سے الگ کر کے تنہائی کی کوٹھڑی میں پابجولاں بند کر دیا جائے اور تین دن روزانہ چھ گھنٹے کھڑی ہتھکڑی بھی لگائی جائے۔ یعنی اگر قیدی نے گستاخی کا جرم کیا ہے تو اِس کے مقابلہ میں تین سزائیں دی جائیں۔ ۱۔ قیدِ تنہائی۔ ۲۔ بیڑی۔ ۳۔ ہتھکڑی۔

تیسری سزا کے سلسلہ میں جیل کے قانون کی روشنی میں یہ لازمی ہوتا ہے کہ سزا دینے سے پہلے قیدی کا معائنہ جیل کے ڈاکٹر سے پیشگی ہونا چاہیئے۔ لیکن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے حکامِ اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے مقدس جذبہ کے زیرِ اثر اِس لازمی ہدایت کو بھی نظر انداز کر کے چیف وارڈ کو حکم نامہ بھیج دیا کہ وہ ان سزاؤں کی تعمیل کرائے۔ چنانچہ چودھری صاحب موصوف کو ہم سے جبراً علیحدہ کر کے تنہائی کی کوٹھڑی میں پابجولاں بند کر دیا گیا اور ساتھ ہی کوٹھڑی کے اندر آہنی جنگلے کے ساتھ کھڑی ہتھکڑی سے بھی باندھ دیا گیا۔ اِدھر یہ حالت تھی اُدھر جیل کے ڈاکٹر مسٹر بیزجی نامی اتفاق سے اِس دِن کسی نجی کام کی وجہ سے زیادہ عرصہ غیر حاضر رہے تقریباً چار بجے کے قریب جیل کے رجسٹر سے چودھری صاحب موصوف کی سزا کا علم ہونے پر گھبرائے سیدھے کوٹھڑی میں پہنچے اور موصوف کی حالت دیکھ کر کشاں کشاں دفتر واپس ہوئے۔ اور یہ دیکھ کر کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل مکان پر ہیں، وہیں پہنچے اور ان کو بتایا کہ اگر کھڑی ہتھکڑی کی سزا جاری رکھی گئی تو وہ چودھری صاحب موصوف کی زندگی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ جب بات زیادہ بڑھی تو ڈاکٹر بیزجی نے اپنی رائے جیل کے رجسٹر پر ثبت کر دی مجبوراً ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ہتھکڑی کھولنے کا حکم دینا پڑا۔ لیکن اِس عرصہ میں سزا اپنا کام کر گئی۔ یعنی دورانِ خون کے بند ہو جانے کی وجہ سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لئے تحریر کے کاموں کے ناقابل ہو گیا۔ ہر چند مالش اور ٹیکے وغیرہ کا سہارا لیا گیا لیکن اِس دن کے بعد سے چودھری صاحب موصوف بائیں ہاتھ سے تحریر کا کام ہرگز نہ لے سکے۔ اِتنی بڑی شدید رکاوٹ سے یہ کوہِ استقلال ہرگز نہ گھبرایا اور بدستور

بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق جاری رکھی۔ یہاں تک کہ بالآخر بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کی جگہ نعم البدل کے طور پر تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ واضح رہے کہ چودھری صاحب کی تمام تر تصنیفات اس المناک حادثہ کے بعد کی تخلیق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چودھری صاحب کی جگہ ہمارے جیسا معمولی قوتِ ارادی کا انسان ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لئے معاشرہ پر بوجھ بن جاتا۔ لیکن چودھری صاحب موصوف کی غیر معمولی قوتِ ارادی نے ایک ناممکن رکاوٹ پر بھی اس پامردی، حوصلے اور استقلال سے قابو حاصل کیا کہ بعد کی معروف زندگی اپنے پیچھے ایسے ادبی، سیاسی اور اخلاقی جواہر پارے چھوڑ گئے جن کی روشنی آنے والی نسلیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستفید ہوتی رہیں گی۔

مرحوم تو کامیابی کے ساتھ اپنا فرض بجا لائے لیکن ہم بدقسمت ابھی تک نشانِ منزل کی طرف رواں ہیں اور عزیزی نصرت قریشی کے اس شعر کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں کہ : ؎

کارواں کس کا سہارا ڈھونڈے
کوئی نقشِ کفِ پا بھی تو نہیں

(منقول از روزنامہ "آزاد" لاہور ۲ر فروری ۱۹۵۷ء)

فسانۂ افضل حق رح

لطیف انور گورداسپوری
لاہور

اے ضیائے بزمِ عالم اے چراغِ زندگی ‌ ‌ تیرے نقشِ پا میں تھا گویا سراغِ زندگی
تیری منزل منزلِ تقدیر سے کچھ کم نہ تھی ‌ ‌ تیری خاکِ رہ گذر اکسیر سے کچھ کم نہ تھی
تیرا سینہ آئینہ سازِ محبت تھا یہاں ‌ ‌ تیری خاموشی میں اندازِ محبت تھا یہاں
تیری آنکھیں جلوۂ امید سے خالی نہ تھیں ‌ ‌ کیا کمندیں آسمانوں نے یہاں ڈالی نہ تھیں
تیری فطرت تیری حسرت تیرا غم تیرا ملال ‌ ‌ شورشِ ہستی میں تھا فکرِ حقیقت کا مآل
تیری گردن غیر کے آگے کبھی جھکتی نہ تھی ‌ ‌ نبضِ دشمن کیا تری تحریر سے رکتی نہ تھی؟
تیرا ہر اک لفظ تھا شرحِ نکاتِ زندگی ‌ ‌ تیری مرگِ بے محابا تھی ثباتِ زندگی

افضلِ حق، حق شناسائے زمانہ زندہ باد
اک حقیقت ہے یہاں تیرا فسانہ زندہ باد